بشیر احمد ڈار

یونانی تصوّف

یونانی فکر کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیانہ تصوّرات کا سب سے پہلے رواج تھریس یعنی مغربی ایشیا کے علاقہ سے شروع ہوا جس کا بانی ایک نیم تاریخی اور نیم افسانوی شخصیت آرفیس تھا جس کی تعلیم ساتویں یا چھٹی صدی قبل مسیح میں تمام یونان میں پھیلی۔ بعض مستند مؤرخین کی رائے ہے کہ تاریخ کے اس دور میں مغربی ایشیا کی دینی اور فکری تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا جس میں صوفیانہ تصوّرات و اعمال کی نمایاں جگہ ہے اور یہ نیا رجحان زیادہ تر سامی افکار اور کچھ زرتشتی عقائد کا نتیجہ تھا۔ فلسفیانہ افکار نے عقلیت پسند ذہنوں کو آبائی اور مروّجہ مذاہب و اقدار سے بدگمان کر دیا تھا اور ان کے قلب ایک زندگی بخش اور اطمینان دلانے والے نظامِ فکر کی تلاش میں تھے۔ اس عبوری دور کی بے اطمینانی اور مسلّمہ اخلاقی اقدار کے کھوکھلے پن سے لوگوں کے ذہن میں بدی اور شر اور اس سے پیدا شدہ احساسِ جرم و گناہ کو تیز تر اور گہرا کر دیا تھا۔ جب مسلّمہ نیکی کے تصوّرات و اعمال میں کوئی اچھائی اور نیکی نظر نہ آئے اور لوگ محسوس کرنے لگیں کہ یہ اعمال جن کو آج تک نیک کہا جاتا رہا ہے درحقیقت ہر قسم کی نیکی و خوبی سے عاری ہیں اور جو لوگ ان اعمال اور رسوم کو ادا کرنے پر مصر ہوں وہ محض ریاکاری اور دکھاوے کی زندگی بسر کر رہے ہوں تو ان حالات میں حساس اور حکیمانہ ذہن کے لوگوں میں ایک روحانی تڑپ کا پیدا ہونا یقینی ہے یہ تڑپ ایک طرف نیکی اور خیر کی پائدار اقدار کی تلاش میں نظر آتی ہے اور دوسری طرف شر و بدی کے جراثیم و داثرات سے محفوظ رہنے کے طریقوں کی نشاندہی میں منہمک نظر آتی ہے۔ یہی وہ ماحول تھا جس میں آرفیسی نظامِ فکر و عمل کی بنیاد پڑی اور اس کی قبولیت کا راز اس میں مضمر تھا کہ اس نے انسانوں کے اس وقت کے مطالبات کو پورا کرنے میں بڑی خوبی کا ثبوت دیا۔ اس میں ایک طرف اخلاقی اقدار کے نئے پیمانے بھی موجود تھے جن کی بنیاد پر ایک زاہدانہ طرزِ عمل اور طریقۂ زندگی پیدا ہوا تو دوسری طرف بعض صوفیانہ مشاغل بھی تھے جن پر عمل پیرا ہونے سے انسان اپنے اصل یعنی خالقِ مطلق سے ربط اور تعلق بھی پیدا کر سکتا ہے۔ تصوف میں شروع سے دو اجزا شامل رہے ہیں اور یہی دونوں اجزا آرفیسی فکر میں بھی پائے جاتے ہیں۔ انسان اور خدا کے درمیان تعلق کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ اور انسانی روح کا خدا کے ساتھ اتحاد کے متعلق مختلف فکری توجیہات۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ آرفیس نے یونانی تاریخ میں پہلی دفعہ خانقاہیں قائم کیں جہاں لوگوں کو اس کے طریقۂ کار

کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی۔ ان خانقاہوں کی مثال عبادت گاہوں یا صومعوں کی سی تھی جو بعد میں صوفیانہ خانقاہوں میں تبدیل ہوگئیں۔ ان علاحدہ عبادت گاہوں کے قائم کرنے کا مقصد ناقدین کی نگاہ میں یہ تھا کہ وہ عام یونانی تصورات و اعمال دین سے مختلف تھا اور ان کی بنیاد چند فلسفیانہ و فکری اصولوں پر تھی جن کی ترویج اور جن کو عملی شکل دینے کے لیے علاحدہ نظام کی ضرورت محسوس کی گئی۔

آرفیس

آرفیس نے اپنے نظامِ فکر کی بنیاد چند تمثیلات پر رکھی جس کا بہترین نمونہ بعد میں عرفانی گروہ اورمانی کے ہاں ملتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب زیوس (ZEUS) خدائے اعظم کے ہاں ایک لڑکا ڈایونیسس۔ زیگریوس پیدا ہوا۔ یہ ابھی چھوٹی عمر ہی کا تھا کہ ٹیٹنوں (TITANS) کے قبضہ میں آگیا جنھوں نے اس کو کھلونے اور شیشہ دیا اور اس کے بعد اسے قتل کر کے کھا گئے۔ لیکن کسی طرح اس کا دل محفوظ رہ گیا۔ اس کے باپ نے وہ دل کھالیا اور اس طرح وہ دیوتا پھر زندہ ہوگیا۔ اس پر دیوتائے اعظم زیوس نے بجلی کی ایک کڑک سے ٹیٹنز کو جلاڈالا۔ ان کی خاکستر سے انسان پیدا ہوا۔ اس طرح انسان دو مختلف اور متضاد اجزا کا مرکب ہے۔ ایک نورانی (ڈایونیسس) اور دوسرا ظلماتی۔ یہ تمثیل یونانی فکر میں اس طرح رچ گئی کہ بعد میں افلاطون جیسا فلسفی بھی انسان کے متعلق یہی آرفیسی محاورہ یعنی "ٹیٹنی فطرت" استعمال کرتا ہے جس سے اس کی مراد یہ تھی کہ اس میں بدی اور شر کی طرف رجحان موجود ہے۔

اس تمثیل اور تصور سے جسم اور روح کا تضاد اس نظامِ فکر کا بنیادی اور مرکزی تصور قرار پایا۔ ایک حیثیت سے روح اور جسم کا اختلاف کیفیت کے لحاظ سے بہت قدیم زمانے سے تسلیم کیا جاتا رہا۔ زندگی میں بعض ایسے تجربات بھی آتے ہیں جن سے انسان روح کے علاحدہ وجود کا قائل ہوجاتا ہے۔ مثلاً خواب کی واردات، آسیبی حالت جب کوئی دوسری روح کسی شخص کے جسم میں عارضی طور پر حلول کر جاتی ہے اور خودموت۔ ان تمام اور اس قسم کے اور دوسرے واقعات کی روشنی میں یہ عقیدہ عام طور پر قدیم زمانے سے تسلیم کیا جاتا رہا کہ انسانی روح جسم سے علیحدہ قائم رہتی اور رہ سکتی ہے۔ لیکن یہ تصور کہ ان دونوں میں فطری طور پر تضاد موجود ہے یعنی روح ایک نورانی شے ہے اور جسم کا تعلق مادی دنیا سے ہونے کے باعث وہ ایک کثیف اور ظلماتی فطرت کا حامل ہے یہ تصور ڈائونیسس اور آرفیسی تصورات کے تحت رائج ہوا جب ان کے پیروؤں میں صوفیانہ جذب و مشاہدات کا ذوق پیدا ہوا۔ اس سے یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ اگر روح جسم کی بندشوں اور مادی حدود سے آزاد ہوجائے تو اس کی قوتوں میں بے اندازہ ترقی اور نشو و نما ہوگا۔ انسان ہمیشہ سے قوت کے حصول کا خواہشمند رہا ہے اور روحانی قوت اور غیبی طاقتوں پر حکمرانی کا جذبہ تو اور بھی کشش کا باعث رہا ہے۔ یہی وجہ تھی جس کے باعث آرفیسی نظام

میں روح کو جسم کی بندشوں سے آزاد کرانے کا تصوّر پیدا ہوا۔ جسم اور روح کا یہ تضاد اور اخلاقی اقدار کے لحاظ سے دونوں کا فرق ہی درحقیقت قدیم سے تصوف اور رہبانیت کا سنگِ بنیاد رہا ہے۔ اس کا دوسرا سبب احساس گناہ ہے جو جسم میں محبوس ہونے کے باعث پیدا ہوتا ہے اور جس سے نجات کا تصوّر عالم وجود میں آتا ہے۔ ان دونوں تصورات کی آمیزش سے آرفیسی خانقاہیں قائم ہوئیں اور زہد و تصوف کا رواج عام ہوا۔ حیوانی گوشت حتیٰ کہ انڈوں کے کھانے کی سخت ممانعت تھی۔ روزے رکھنے کے حکم پر سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ آرفیسی نظام میں اخلاقی طور پر اباحت کا دروازہ کھلا تھا لیکن جدید تحقیقات سے یہی ثابت ہوا ہے کہ ان کے پیروؤں میں کم از کم ابتدائی دور میں اخلاقی بلندی اور زہد و ریاضت کی طرف رجحان تھا۔ لیکن جس طرح ہر اچھی تحریک اپنے ابتدائی دور کے بعد کچھ اپنی تصورات کے زیر اثر اور کچھ انسانی کمزوریوں کے باعث اپنی بلندی سے گر جاتی ہے اسی طرح آرفیسی نظام کا بھی حشر ہوا۔ چنانچہ افلاطون نے جمہوریت (باب دوم، ۱۶۴ ای) میں ان آرفیسی فقراء کا ذکر کیا ہے جو قریہ بہ قریہ اور شہر بہ شہر پھر کر بھیک مانگتے اور جنتر منتر، تعویذوں اور دعاؤں کے ذریعہ سادہ لوح لوگوں کے مال پر ڈاکہ ڈالتے تھے اور اس طرح انہیں گناہوں سے نجات اور مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا آسان طریقہ بتاتے تھے۔

کائنات کے متعلق ان کا نظریہ یہ تھا کہ ماہیت مطلقہ سے اشعاع کے مختلف سلسلوں کا صدور ہوا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور پھر ایک نئی کائنات تخلیق ہوتی ہے۔ انسانی روح نور ازلی کے چند بکھرے ہوئے اجزا ہیں جو گر پڑ کر اس زمین پر آپہنچے ہیں۔ لیکن ماہیت مطلقہ کے اولین بروز (EMANATION) یعنی روح کلی سے ہم بہت دور واقع ہیں اور اس لیے ہماری مراجعت کا راستہ بھی اسی نسبت سے دور اور دشوار گزار ہے[1]۔

موت کے بعد کی زندگی کا تصوّر بھی ان کے ہاں موجود ہے۔ مرنے کے بعد ایک نیک اور پرہیزگار انسان کی روح ایک ہزار سال (یا یونانی شاعر پنڈار کی رو سے صرف آٹھ سال) تک عالم اسفل میں اپنا اجر پاتی ہے اور اسی طرح ایک بدآدمی کی روح اسی عرصے میں اپنی بدی کی سزا سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ کسی دوسرے جسم میں نمودار ہوتی ہے اور اس طرح زندگی اور موت کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس دوامی اور دوری زندگی سے نجات صرف اس کو حاصل ہو سکتی ہے جو اس زندگی اور موت کے بعد کی زندگی میں نیکی کے اصولوں پر کاربند رہے۔ جب کوئی شخص تین ایسی زندگیاں (تین اس زمین پر اور تین پاتال میں) گزار چکے تو وہ اس چکر سے مکمل اور آخری طور پر

---

[1] نو افلاطونی فلسفی پروکلس کی شرح جمہوریت افلاطون۔ دیکھئے انسائیکلوپیڈیا مذہب و اخلاق جلد اول، صفحہ ۱۹۸ ب۔

نجات حاصل کرلیتا ہے اور تمام گناہوں اور آلائشوں سے پاک ہوکر جنّت میں داخل ہوجاتا ہے۔ جنوبی اطالیہ سے کچھ آرفیسی تختیاں دستیاب ہوئی ہیں جن سے چند رسوم کا پتہ چلتا ہے۔ دفن کرتے وقت آرفیسی لوگ میت کے ساتھ چند ہدایات رکھ دیتے تھے جن کی مدد سے وہ ابدی سکون حاصل کرسکے۔ ان تختیوں پر عالم اسفل کی مندرجہ ذیل تفصیلات درج ہیں۔ ایک طویل اور پریشان کن سفر کے بعد روح ایک ایسی سڑک پر گامزن ہوتی ہے جس کے دونوں طرف پانی کے چشمے ہوتے ہیں۔ بائیں ہاتھ کے چشموں کو چھوڑ کر وہ دائیں طرف کے چشموں کے محافظین کی طرف متوجّہ ہوتی ہے اور ان سے پاک وصاف پانی طلب کرتی ہے۔ اس کے بعد اس میں نورانی اجزا اپنی پوری چمک دمک سے نمودار ہوتے ہیں اور وہ پاک لوگوں کی صحبت میں جا پہنچتی ہے۔

آرفیسی تصوّف اور اس کے مختلف افکار و اعمال کا اثر یونان کے عوام اور خواص سبھی پر ہوا اور بہت جلد یہ خیالات عام ہونے شروع ہوئے۔ تصوف اور اداراتی دین کا فرق یہ ہے کہ تصوف محض افراد کی داخلی زندگی تک محدود رہتا ہے اور دین کا مقتضا یہ ہے کہ وہ ہم یقین افراد کی خارجی زندگی میں چند ضوابط اور قواعد کی پابندیوں سے ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ آرفیسی نظام چونکہ صوفیانہ طرز کی راہبانہ زندگی پیدا کرنا چاہتا تھا اس لیے لازمی طور پر اس سے صرف چند افراد متاثر ہوئے اور یونان کے عوام میں اس سے کوئی ہمہ گیر دینی تحریک پیدا نہ ہوسکی۔ تاہم ان کے چند مخصوص تصوّرات تمام یونانی فلاسفہ و مفکرین کے کلام میں سرایت کرگئے اور اس طرح آہستہ آہستہ وہ زبان زدِ عوام ہوگئے۔

شاعر پنڈار شاید پہلا یونانی مصنّف تھا جس نے حیات بعد الموت کے آرفیسی نظریات کی تبلیغ شروع کی اور بعض کا خیال ہے کہ وہ یورپ کا پہلا شخص ہے جس نے جنت کے متعلق بلند شاعری میں عمدہ تصورات پیش کئے۔ اسی طرح انسان کی نورانی پیدائش کا تصوّر بھی اسی کے ذریعہ عوام میں پہنچا۔ اسی طرح فیثاغورث، سقراط اور افلاطون سبھی ان افکار سے متاثر ہوئے۔ افلاطون نے روح کا جو تصور اپنے مکالمہ فیڈرس میں پیش کیا ہے وہ آرفیسی نظریات پر مبنی ہے۔

فیثاغورث

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فیثاغورث کی کوشش یہ تھی کہ آرفیسی نظام میں مناسب تبدیلیاں کی جائیں جن سے اس کی خرابیاں دور ہوسکیں[1]۔ اس کے نزدیک آرفیسی نظام میں صرف چند اصلاحات کی ضرورت ہے اگرچہ اس کا

---

[1] الف۔ ایم۔ کورن فورڈ، مذہب سے فلسفے تک۔ دیکھئے برٹرینڈ رسل کی کتاب 'مغربی فلسفے کی تاریخ' (لندن ۱۹۴۷)، صفحہ ۵۰ اور ڈین انج کی کتاب فلاطینوس (لندن ۱۹۴۸) جلد اول صفحہ ۸۷

نظامِ عمل بالکل صحیح ہے۔ فیثاغورث کا خیال تھا کہ اخلاقی اقدار کے قیام و ارتقاء کے لیے ظاہری اعمال اور رسوم کی اتنی اہمیت نہیں جتنی نیت اور روح کی۔ اگر کوئی شخص دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے قربانیاں دیتا رہے، سفید بے داغ کپڑے پہنتا پھرے اور ہاتھ اُٹھا کر دعائیں مانگتا رہے تو ان سے اس کی اخلاقی زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس کا دل ان اعمال کی روح سے ناآشنا ہے۔ اگر بنیادی اقدارِ حیات کی حقیقی اہمیت سے وہ بے خبر ہے تو یہ اعمال اس کے کسی کام نہیں آسکتے۔ آرفیسی نظام کی فکری بنیاد جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس اصول پر قائم تھی کہ انسان کی روح عالم بالا سے صعود کر کے اس عالمِ سفلی میں داخل ہو چکی ہے اور اس ہبوط سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسے مجاہدات و ریاضتِ نفس کی ضرورت ہے۔ لیکن ان کے ہاں ڈائونیسس دیوتا کے پیروؤں کی طرح کچھ غیر اخلاقی رسوم بھی موجود تھیں جن سے حاضرین کے جذباتِ سفلی میں انگیخت ہونے کا امکان موجود تھا۔ ان میں سے ایک رسم عشائے ربانی بھی تھی جہاں لوگ مل کر کھانا شراب استعمال کرتے تھے اور اس طرح ان کے خیال میں وہ دیوتاؤں کے غم و خوشی میں شریک ہوتے تھے۔[1] اس طرح انسان اور خدا کے درمیان جو ربط و ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اس کے لیے آرفیس نے "تھیوریا" کا لفظ استعمال کیا۔ تھیوریا سے مراد انسان کی وہ نفسیاتی حالت ہے جب وہ جذبات کی انتہائی شدت کے زیرِ اثر اپنی انفرادی ہستی کو بھول کر اپنے آپ کو خدائے مطلق کا محض پرتو یا سایہ سمجھتا ہے اور جس وقت افضالِ الٰہی کا انکشاف اس پر ہوتا ہے۔[2] فیثاغورث نے محسوس کیا کہ ایک اچھے مقصد کے حصول کے لیے یہ طریقہ اخلاقی طور پر صحیح نہیں۔ اس نے سلوک اور مشاہدات کے جذباتی عنصر کو ختم کر کے اس کی جگہ خالص عقلی اور اخلاقی طریقہ رائج کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر انسان اپنی روح کے بلند ترین قویٰ یعنی عقل و مشاہدہ کو پورے طور پر استعمال کرے اور مجاہدات و ریاضات پر کاربند رہے تو وہ خدائے مطلق کے ساتھ رابطہ پیدا کر سکتا ہے۔ محض جذبات کی انگیخت اس مقصد کے لیے نہ صرف بے کار بلکہ اخلاقی طور پر نقصان دہ ہے۔ اس طرح فیثاغورث نے آرفیسی "تھیوریا" کی قلب ماہیت کر کے مذہبی افکار میں ایک بہتر تصور کا اضافہ کیا۔[3]

فیثاغورث ۵۸۰ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے زمانے کے تمام متمدن ملکوں کا دورہ کیا۔ مصر اس دور میں تمدنی طور پر کافی مشہور تھا۔ وہاں کے مندروں کے کاہن اور دیگر عالم اپنے مختلف علوم و فنون کے لیے مشہور تھے۔

---

[1] عیسائیوں میں عشائے ربانی کی رسم کا صحیح ماخذ یہی قدیم یونانی رسوم تھیں جو بعد میں عیسائیوں نے اختیار کر لیں۔ [2] اس کی مثالیں قدیم اور موجودہ زمانے میں کافی ملتی ہیں جب متصوفین چند منشی اور مُسکر چیزوں کے استعمال سے محویت اور بے خودی کی حالت اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں اور "اللہ ہو" کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ [3] انگریزی زبان کا لفظ "تھیوری" جس کا ترجمہ عام طور پر نظریہ کیا جاتا ہے اسی لفظ سے ماخوذ ہے اور اس کے موجودہ معنی گویا فیثاغورثی نظریات کے زیرِ اثر قائم ہوئے ہیں۔

بابل وکلدانیہ کی مذہبی روایت، اور اسرائیلی اور زرتشتی تصورات بھی یونانی افکار کے مقابلے پر زیادہ با اثر اور اپنی معنویت کے لحاظ سے زیادہ اہمیت و وسعت کے حامل تھے۔ فیثا غورث نے ان سب سے استفادہ کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فیثا غورث کے نظریات اور اعمال میں اس وقت کے تمام علوم و افکار ایک جگہ جمع ہو گئے اور مشرقی اور مغربی حکمت کے تمام چشمے ایک ہی جگہ مرکوز ہو گئے۔ افلاطون نے اپنی جمہوریت (باب ۱۰، ۰۰ [illegible] ایک جگہ فیثا غورث کا ذکر کیا ہے کہ اس نے لوگوں کے سامنے ایک نظریۂ حیات و ایک طریقۂ زندگی یعنی دین پیش کیا اور اس کے پیرو اس سے شدید محبت و عقیدت کا جذبہ رکھتے تھے اور آج تک بھی (یعنی سقراط اور افلاطون کے زمانے تک) اس کے پیرو اپنے مخصوص عقاید و اعمال کے باعث دوسروں سے ممتیز ہیں۔ ارسطو نے فیثا غورث کے متعلق ایک علاحدہ رسالہ لکھا جو اگرچہ ضائع ہو چکا ہے تاہم اس کے اقتباسات دوسرے مصنفین کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ معجزات و کرامات جو عام طور پر فیثا غورث کے ساتھ منسوب تھے وہ چوتھی صدی قبل مسیح میں زبان زد عام تھے اور ایتھنز کے باشندے ان قصوں پر یقین رکھتے تھے۔

فیثا غورث کے عقاید مندرجہ ذیل تھے: (۱) روح جسم سے عارضی یا مستقل طور پر علاحدہ رہ سکتی ہے۔ اس طرح انہوں نے جسم کے مقابلہ پر روح کی برتری کو تسلیم کیا۔ (۲) انسان اور حیوان میں ہم آہنگی موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسانی روح بعض دفعہ حیوانوں کے جسم میں ظاہر ہو سکتی ہے۔ (۳) روح کو جسم کے مقابلہ پر زیادہ با قوت بنانے کے لیے چند اوامر و نواہی کی پابندی لازمی ہے۔ اگر انسان اپنے نفس پر کسی قسم کا جبر نہ کرے اور بلا اکراہ ہر خواہش کو پورا کرتا چلا جائے تو اس سے اس کی روح کی بالیدگی اور اس کے ارتقا میں خلل آنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ہمارے اردگرد خیر و شر، نیک و بد ہر قسم کے میلانات موجود ہیں، ان میں سے خیر و نیکی کے اعمال کو اختیار کرنا اور ان کے مطابق اپنی اور دوسروں کی زندگی ڈھالنا اور شر اور بدی کے اعمال سے پرہیز ہی میں روح کی صحیح نشوونما مضمر ہے۔ ان افکار کی ترویج کے لیے جب فیثا غورث جیسی بلند شخصیت میسر آئی تو یونان جیسے کم متمدن ملک میں ان کی کامیابی کچھ بعید نہ تھی۔ اس نے ان تصورات و عقاید کے قدیم مشرکانہ اور طفلانہ لباس کو دور کر کے ان کی بنیاد پر ایک بلند اخلاقی نظریۂ حیات پیش کیا۔

فیثا غورث کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ جسم انسانی روح کا قید خانہ یا قبر ہے۔ لیکن آرفیسی اور فیثا غورثی تعبیر میں یہ فرق ہے کہ آرفیسی نظام میں اس عقیدہ کی بنا پر ایک ایسا نظامِ عمل قائم ہوا جس کا نقطۂ نگاہ محض سلبی تھا، یعنی ان کے خیال میں روح کا جسم میں قید ہو جانا انسان کی انتہائی بدقسمتی تھی جس کے باعث وہ اپنی فطری نورانیت سے محروم ہو گیا اور اب اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اس قید سے نجات حاصل کرے۔ اس کے برعکس فیثا غورث نے اس اصول کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی سلبیت کو ایجابی شکل دے دی۔ انسانی روح کو جسم میں قید کرنا در حقیقت

انسان کی بھلائی کے لیے ہے۔ یہ روح کا ہبوط نہیں بلکہ عروج ہے، کیونکہ اس طرح ان بلندیوں تک پہنچنے کا راستہ اس کے لیے کھل جاتا ہے جو اس کے بغیر اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ جسم اور روح کی یکجائی کوئی بدقسمتی یا سزا نہیں بلکہ بلند تر اخلاقی اور روحانی قوتوں کے حصول کا ایک بہترین ذریعہ ہیں۔[1] اس کے علاوہ فیثاغورث کے نزدیک اخلاق کا بہترین نصب العین یہ تھا کہ [redacted] خدائی صفات کا حامل ہو، اس کی خوبیوں کی پیروی کرے اور اپنی زندگی خدائے مطلق کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے۔ یہ نصب العین بھی اس نظام کو آرفیسی طریقۂ زندگی سے متمیز کرتا ہے۔ آرفیسی عقیدہ تھا کہ انسان کا بلند ترین مقصد روح کو جسم کی قید سے نجات دلانا ہے جس کو بدھ مت کی زبان میں نروان کہا جا سکتا ہے یعنی اس دوری زندگی کی مصیبت سے چھٹکارا۔ اس میں انسان کے لیے کوئی اثباتی لائحۂ عمل موجود نہیں۔ وہ فرار کا راستہ ضرور دکھاتا ہے لیکن زندگی کو بامقصد قرار دے کر اس کو بسر کرنے کا طریقہ اس کے پاس کچھ نہیں۔ اس کے برعکس فیثاغورث نے اپنے پیروؤں کے سامنے ایک اثباتی نصب العین رکھا جس کے باعث اس کا صوفیانہ نظام اس کے پیشرو آرفیسی اور بعد کے صوفیانہ نظاموں کی منفیانہ اور حیات گریز رجحانات سے محفوظ رہ گیا۔ افلاطون کے مکالمہ کریٹیلس (۴۰۰ ب) میں سقراط نے آرفیسی نظریہ جسم اور روح کو پیش کر کے ان کی استعمال کردہ اصطلاحات کی لغوی تشریح اس طرح کی کہ اس کا سلبی پہلو ایک اثباتی رخ اختیار کر گیا اور ناقدین کا خیال ہے کہ یہ تبدیلی فیثاغورثی نقطۂ نگاہ کے زیر اثر عمل میں آئی۔ "بعض کہتے ہیں کہ جسم روح کی قبر ہے جو اس زندگی میں اس میں مدفون ہے .... یہ اصطلاح شاید آرفیسی شعراء نے وضع کی تھی اور ان کا خیال تھا کہ روح اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہی ہے اور یہ کہ جسم ایک قید خانہ ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک باڑہ ہے جس میں روح کو اس لیے رکھا گیا ہے تاکہ اس کی حفاظت ہو سکے ....."[2]

فیثاغورث نے اپنے پیروؤں کو تاکید کی تھی کہ وہ ہر صبح اور شام اپنے نفس کا محاسبہ کریں۔ سونے سے پہلے ان کے فرائض میں یہ شامل تھا کہ وہ اپنے آپ سے یہ سوال کریں کہ کس حد تک ان سے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی ہوئی ہے اور کون کون سا فعل ان سے سرزد ہوا ہے جو انہیں نہیں کرنا چاہیئے تھے اور وہ کون سے اعمال ہیں جو ان کو کرنے ضروری

---

[1] مکالمۂ فیڈو (۶۱ د - ۶۲ ب) میں سقراط خودکشی کے خلاف دلائل پیش کرتا ہے۔ وہ حیرانگی کا اظہار کرتا ہے کہ اس کے کچھ شاگرد فیلولاس کی تعلیم سے بے خبر ہیں۔ فیلولاس اس دور کا مشہور ترین فیثاغورثی تھا۔ سقراط کی ایک دلیل یہی فیثاغورثی "بلند تعلیم" ہے کہ انسانی روح جسم کی قید میں محبوس ہے اور اس لیے کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خدا کی مرضی اور رضا کے بغیر اس قید سے چھٹکارا حاصل کرے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم خدا کا مال ہیں اور وہ ہم پر نگہبان اور رکھوالا ہے اس لیے ہر حالت میں اس کی رضا مقدم ہے۔ دیکھئے انسائیکلوپیڈیا مذہب و اخلاق جلد ۱، صفحہ ۵۲۶ و ب

[2] دیکھئے جوویٹ کا ترجمہ مکالمات افلاطون (نیویارک، گیارھویں طبع) جلد اول، صفحہ ۱۹۰۔

تھے لیکن وہ ان کو سرانجام دینے سے معذور رہے۔ ہر روز کا یہ عملی محاسبہ نہ صرف ان کو نیکی کے راستے پر گامزن رکھنے میں معاون تھا بلکہ اس طرح عقلی طور پر اخلاقیات کے مختلف مسائل انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں جس سے وہ خیر اور شر اور دیگر اخلاقی مسائل کو عقلی طور پر پرکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

فیثاغورث کے نزدیک یہ زندگی ایک اجتماع ہے اسی طرح کا جس طرح مثلاً اولیمپک کھیلوں میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں حصہ لینے والے لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک گروہ تو محض خرید و فروخت کرنے آتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے لوگ وہ ہوتے ہیں جو کھیلوں میں حصہ لینے آتے ہیں۔ لیکن تیسرا اور بہترین گروہ وہ ہے جو محض تماشائی کی حیثیت سے شامل ہوتے ہیں۔ افلاطون کے اخلاقی نظام میں مشاہدات و ریاضات کی زندگی کو عملی زندگی پر ترجیح دی گئی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ اس شخص کا اوّلیں فرض ہے جو محسوسات کی دنیا (یعنی افلاطونی تمثیل کے مطابق تاریک غار) کی قید سے نجات حاصل کر چکا ہو کہ وہ مشاہدہ اور مجاہدہ کی زندگی پر قناعت کرے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ گاہے بہ گاہے اسی محسوسات کی دنیا میں واپس آکر دوسرے لوگوں کو بھی اس دھوکے سے نجات دلانے کی کوشش کرے۔ اسی طرح ارسطو کے ہاں حکمتِ نظری اور حکمتِ عملی کی تقسیم موجود ہے اور اس کے خیال میں حکمتِ نظری کی زندگی حکمتِ عملی کی زندگی کے مقابلہ پر ہر حالت میں بہتر ہے اور یہی انسانی زندگی کا بلند ترین نصب العین ہونا چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں فیثاغورث کی تقسیم یونانی فلسفۂ اخلاق میں مسلم رہی ہے اور یہی نظریہ تصوف کا بہترین منبع ہے۔ صوفیانہ زندگی کا مابہ الامتیاز یہی نقطۂ نگاہ ہے کہ محسوسات کی دنیا اور اس کے تمام مشاغل غیر اہم اور بے کار ہیں۔ مادی دنیا کی لذتوں اور دلچسپیوں میں آلودہ ہو کر دوسری دنیا اور اس کے تقاضوں کو فراموش کرنا ایک اخلاقی گناہ اور عقلی طور پر نادانی کے مترادف ہے۔ حکیم و دانشمند آدمی وہی ہے جو اس آنی و فانی کائنات سے بالا ہو کر ایک پائدار حقیقت کی طرف رجوع کرے۔

فیثاغورث کے متعلق یہ عام طور پر مشہور ہے کہ وہ روح کی بقا اور تناسخ ارواح کا قائل تھا اور آرفیسی نظام کی طرح یہی دونوں عقیدے اس کے پیروؤں میں زہد و مجاہدات کی زندگی پیدا کرنے کے باعث ہوئے جو روایات ہمیں خود فیثاغورث اور اس کے قدیم پیروؤں کے متعلق ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی بالکل سادہ تھی۔ ہیروڈوٹس بیان کرتا ہے کہ آرفیس کی طرح فیثاغورث نے بھی مُردوں کو اونی کپڑے کے کفن میں دفن کرنے سے منع کیا تھا۔ ان کی زاہدانہ زندگی میں دو باتیں نمایاں تھیں: (ا) ہر ایک کو خاموش رہنے کی تاکید تھی تاکہ اس طرح وہ بے ہودہ اور غلط باتوں کے کرنے سے محفوظ رہ سکے (ب) شادی سے پرہیز یا کم از کم کثرتِ مباشرت پر پابندی۔ ان پابندیوں کا مقصد جہاں لوگوں کو ضبطِ نفس کی تربیت دینا تھا وہاں اس کا

مقصد یہ بھی تھا کہ انسانی نسل کی افزائش پر پابندیاں عائد کر دی جائیں تاکہ انسان اس مادی دنیا کی قید سے نجات حاصل کر سکے۔ تجرد کی زندگی کے حق میں بنیادی طور پر یہی نظریہ کام کرتا رہا ہے کہ انسان کی تخلیق کسی نیک مقصد کے لیے نہیں ہوئی۔ اس کا باعث خالق مطلق کی حکمت و دانائی نہیں بلکہ شیطانی قوتوں اور اہرمنی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہی نظریہ بعد میں مانی کی تمثیلات میں جا کر واضح ہوتا ہے اور جس کی بنا پر تمام صوفیانہ نظاموں میں انسانی نسل کے انقطاع کی طرف رجحان رہا۔

نوفیثاغورثی مکتب فکر

تین صدیوں کے بعد حالات نے کروٹ لی۔ ارسطو اور افلاطون کے پیروؤں نے علاحدہ علاحدہ دائرے اور حلقے قائم کیے اور اس کے بعد رواقی اور ان کے مخالف گروہ ایپی غورس کے حامیوں نے بھی اپنے اپنے فرقے بلند کئے اور ہوتے ہوتے تمام حکمت و فلسفہ کا مرکز یونان کی سرزمین سے اُٹھ کر اسکندریہ میں منتقل ہو گیا جہاں فیثاغورث کے نام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک نیا حلقہ قائم ہوا جس کو تاریخ فلسفہ میں نوفیثاغورثی دبستان کا نام دیا جاتا ہے جو عیسائیت کے عالم وجود میں آنے سے کچھ عرصہ پہلے علمی دنیا میں اپنا خصوصی مقام پیدا کر چکا تھا۔

ان کا سب سے نمایاں تصور ثنویت ہے جو اگرچہ تمام یونانی فکر کا نمایاں خاصہ رہا ہے لیکن نوفیثاغورثی فلسفیوں کے ہاتھوں اس کی سلبی خصوصیات ابھر کر سامنے آگئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ زرتشت کی دینی تعلیم جو بعد میں مختلف اثرات کے باعث ثنویت کی علمبردار بن گئی اس خاص نظریے کی تشکیل کا باعث بنی اور یہی وہ ثنویت ہے جو ہر صوفیانہ اور راہبانہ نظام کی بنیاد رہی ہے۔

ان کا خیال تھا کہ خدا اور کائنات، بدن اور روح میں مطلق دوئی ہے۔ خدا روح مطلق اور ماورائے کائنات ہے اور روح ہی اصول خیر ہے اور مادہ اور جسم اصول شر۔ ان دو کے درمیان ایک آفریدگار ہے اور بے شمار ارواح خبیثہ ہیں جن کی حکومت زمین اور چاند کے درمیان ہے۔ اس طرح ایک تثلیث قائم ہوئی۔ ــــ خدا، آفریدگار اور عالم۔ روح جو نورانی ماہیت کی حامل ہے اس جسم مادی کے قید خانے میں محبوس ہو گئی ہے۔ یہ جسم روح کا مددگار یا اس کے مقاصد کے حصول کا آلہ نہیں بلکہ سنگِ راہ اور رکاوٹ ہے۔ اگر انسان روحِ ازلی کے ساتھ رابطہ کا طلب گار ہے تو جسم اور اس سے پیدا شدہ جذبات پر قابو پانا ناگزیر ہے۔ اسی اصول پر ریاضت و مجاہدات کا ایک طویل نظام قائم کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ انسان مادی آلائشوں اور جسمانی قیود سے بالا ہو کر خالص روحانی قوت حاصل کر سکے۔ اس کے چاروں طرف بدی اور شر کے بے شمار مظاہر اس کو گھیرے ہوئے ہیں جو اس کی روحانی پرواز میں حائل ہیں۔ ان حالات میں بہترین لائحۂ عمل یہی ہے کہ وہ دنیا اور اس کے مختلف

مشاغل سے منہ موڑ کر تنہائی اور علاحدگی کی زندگی بسر کرے۔ اور اس زندگی میں چند اوامر و نواہی کی پابندی ضروری ہے۔ اوامر میں جسمانی اور روحانی پاکیزگی اور طہارت، گناہوں اور آلودگیوں سے مغفرت کے لیے چند رسوم و عبادات کی ادائیگی، نواہی میں چند قسم کے کھانوں سے پرہیز مثلاً شراب اور گوشت کا استعمال ممنوع تھا اور اسی طرح عائلی زندگی سے جزوی یا مکمل طور پر پرہیز وغیرہ۔

اس کے ساتھ تناسخ ارواح کا عقیدہ بھی ان میں موجود تھا جس کے مطابق ان کا کہنا تھا کہ پہلے جنم میں گناہوں اور غلط کاریوں کا نتیجہ ان کو موجودہ جسمانی زندگی میں ادا کرنا ہے اس لیے ان پر دُہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے تاکہ وہ گذشتہ بدلیوں کے داغ بھی دور کریں اور موجودہ زندگی میں اور گناہوں سے محفوظ رہ سکیں اور اس طرح اس دوری زندگی اور آواگون کے چکر سے مکمل اور دائمی نجات حاصل کر سکیں۔

اس تحریک کا دوسرا رُخ یہ تھا کہ اس کے پیرووں نے رواقی مادیت کے خلاف ایک زبردست احتجاج کیا۔ اس کے برعکس انہوں نے ارسطو کے اصول ازلیت کائنات کو اختیار کیا۔ لیکن اس کی کائناتی تعبیر کے بجائے محض انسانیاتی تعبیر ان کے سامنے رہی۔ اور اس بنا پر انہوں نے انسان کی ازلیت و قدامت کا نظریہ بڑے زور و جوش سے پیش کیا۔ انسان کی ازلیت کا عقیدہ کسی حد تک ان کے ابتدائی موقف کا ایک لازمی تقاضا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کی روح خدائے مطلق کے نور ازلی کا ایک جزو ہے اس لیے خود انسان کا ازلی ہونا بعید از قیاس نہیں کیونکہ اس کی حقیقی نوعیت کا دار و مدار آخر کار محض روح کے وجود پر ہی تو ہے۔ اگر قوتِ تخلیقی کائنات میں ازلی و قدیم ہے تو انسان میں بطرزِ اولیٰ اس کا ازلی ہونا ظاہر ہے۔

انسانی عظمت کا یہ اعتراف اس قدیم زمانے میں بدقسمتی سے بہت محدود رہا۔ لیکن تاہم اس تصور کا سنگِ بنیاد اسی دور میں رکھا گیا۔ اس اعتراف کی ضرورت بھی تھی۔ جب یہ تسلیم کیا جائے کہ انسان جسم کی قید کے باعث چند مجبوریوں اور بندشوں میں جکڑا ہوا ہے اور اس کے ارد گرد بے شمار قوتیں ایسی ہیں جو اسے نیکی کے راستہ پر گامزن ہونے سے روکتی ہیں تو اس حالت میں مختلف افراد کی نجات کا ایک راستہ صرف یہ رہ جاتا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو ان مصائب اور مشکلات سے نجات حاصل کرنا چاہیں وہ ایک بلند و بالا انسان کی راہنمائی تلاش کریں۔ یہ عظیم الشان انسان کچھ اپنی غیر معمولی قوتِ ارادی اور عقل و بصیرت کے باعث اور کچھ روحانی دنیا کی طرف سے خاص ہدایات کے زیر اثر اس قابل ہوتا ہے کہ دوسرے افراد میں بھی اپنے جیسی صلاحیتیں پیدا کر سکے۔

ان کے ہاں خدا کا تنزیہی اور ماورائی تصور اتنا واضح اور صاف تھا کہ ان کے لیے انسان اور خدا کے درمیان وسیع خلیج کو پاٹنا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ لیکن حالات و واقعات کچھ ایسے پیدا ہو گئے کہ اس ماورائی تصور کو قائم رکھتے ہوئے ان دونوں کے درمیان کچھ نہ کچھ تعلق قائم کرنا ضروری ہوا۔ چنانچہ اس کا واحد راستہ ان کے لیے یہی تھا

کہ ایک طرف انہوں نے وحدتِ مطلقہ کی ماورایت بھی قائم رکھی اور دوسری طرف تمام انسانوں میں سے چند ایسے برگزیدہ انسان منتخب کیے جو کسی نہ کسی طرح اس کے ارادوں اور اس کی رضا سے واقفیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ جن میں سے فیثا غورث کا نام سرفہرست ہے اس منزل تک صرف اپنے زہد و ریاضت سے پہنچتے ہیں اور اس طرح ان پر الہام و وحی نازل ہوتا ہے۔ یونان میں قدیم سے حکیم و فلسفی یعنی مرد دانا کا تصور موجود تھا کیونکہ ان کے ہاں فلسفہ کا آغاز محض نظری حیثیت سے نہیں ہوا تھا بلکہ انسانی زندگی کے مسائل اور عقلی تجسس کی کاوشوں کو دور کرنے کے لیے چند انسانوں نے حکمت کی طرف توجہ کی تھی۔ اسی وجہ سے عام طور پر مشہور ہے کہ فیثا غورث کے ہاں دو طرح کی تعلیم تھی۔ ایک عمومی اور دوسری خصوصی۔ عمومی تعلیم سب لوگوں کے لیے تھی لیکن خصوصی تعلیم نہ صرف خفیہ تھی بلکہ صرف چند انسانوں تک محدود رکھی جاتی تھی۔ یہی عمومی اور خصوصی کی تقسیم بعد میں ظاہر و باطن کی تقسیم پر منتج ہوئی۔ باطنی تعلیم کا تمام دارومدار کشف والہام کی بنا پر ہوتا ہے جو کسی خاص مرد عظیم پر وارد ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ حالت دوسروں پر طاری کی جا سکتی ہے لیکن کس و ناکس اس کا اہل نہیں۔

عرفانی تحریک

یہی وہ بنیاد یا بنیادیں تھیں جن پر مغربی ایشیا اور اسکندریہ میں عرفانی گروہ کے تصورات ظاہر ہونا شروع ہوئے یہ ایک ایسی تحریک تھی جو دوسری صدی قبل مسیح سے شروع ہو کر دوسری صدی عیسوی تک ان تمام ملکوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی رہی۔ اس تحریک نے اپنے بنیادی تصورات کے اظہار کے لیے عجیب و غریب قسم کی تمثیلات پیش کیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مختلف مذاہب و تصورات سبھی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس میں ایک طرف قدیم بابلی ستارہ پرستی کے اجزا بھی موجود تھے اور زرتشتی اور متھرائی تصورات سے بھی استفادہ کیا گیا۔ لیکن سب سے زیادہ اثر جو اس تحریک میں نمایاں نظر آتا ہے وہ مصری مذاہب و افکار کا ہے۔ عرفانی تحریک کے پیشرو ہرمیس کے نوشتے خالص مصر کی پیداوار ہیں اور اس کے علاوہ دونوں میں اتنی واضح مماثلت نظر آتی ہے کہ بادی النظر میں ہی استفادہ کا امکان نظر آتا ہے۔ کائنات نور اور عمل ظہور و بروز (ENAMATION) سے نشاۃ یا قرون کا ظہور وغیرہ نظریات سبھی مصری افکار سے مستعار لیے گئے ہیں۔ اسی طرح تمام روحوں کا ہستی مطلقہ میں ادغام کا تصور بھی عرفانیوں نے یہیں سے لے لیا۔

عرفانی تحریک کا نظریۂ حیات ثنویت مطلقہ پر مبنی ہے۔ ایرانیوں کے ہاں فطرت کے دو اجزا نور اور ظلمت ایک ابدی جنگ و جدل میں مشغول نظر آتے ہیں لیکن عرفانیوں نے اس طبعی ثنویت کو یونانی فلسفیانہ افکار کے زیر اثر مابعد الطبیعی ثنویت میں تبدیل کر دیا۔ نور و ظلمت کا تضاد اب مادہ اور روح، کائنات سفلی اور کائنات بالا کی شکل میں پیش کیا گیا۔ اگرچہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں تاہم کسی نہ کسی طرح یہ دونوں اجزا ہماری زندگی میں آمیز ہو چکے ہیں۔ اس دنیا میں بدی

اور شر کا وجود سب اس نامناسب آمیزش کا نتیجہ ہے اور اسی آمیزش کے باعث جو ناخوشگوار حالات پیدا ہو چکے ہیں ان سے نجات حاصل کرنا ہر انسان کا مقصد ہونا چاہیئے۔

اس بنیادی ثنویت کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا تصور جس کو عرفانی تحریک کا لازمہ سمجھنا چاہیئے ان کا تصور جبریت ہے۔ یونانیوں کے ہاں قسمت کا تصور اتنا وسیع تھا کہ ان کے نزدیک نہ صرف انسان بلکہ خود دیوتا بھی اس عالمگیر قوت سے آزاد نہیں۔ اس تصور جبریت کے ساتھ بعد میں بابل کی ستارہ پرستی نے مل کر ایک ایسی خوفناک شکل اختیار کر لی کہ انسان محض بے جان ہستی بن کر رہ گیا جو خارجی قوتوں کی گردش سے کبھی ادھر اور کبھی اُدھر چلتا پھرتا ہے۔ سیاروں کی گردش انسان کی زندگی اور اس کے مستقبل پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اور پیدائش سے لے کر موت تک وہ بظاہر آزاد و خود مختار زندگی بسر کرتا ہے لیکن درحقیقت اس کے تمام افعال و افکار اپنے پیدائشی ستارہ کے زیر اثر ظاہر ہوتے ہیں جن میں اس کی ذات کو کوئی دخل نہیں۔ عرفانیوں نے یہ تمام تصورات اختیار کر لیے اور ان کا مقصد درحقیقت دینی اور اخلاقی تھا تاکہ انسان کو ان تمام پابندیوں اور علائق سے نجات دلائی جا سکے اور اس کی صحیح اور خالص فطرت کو بروئے کار لانے کا سامان مہیا کیا جا سکے۔ لیکن یہ راستہ بھی انہوں نے اسی بابلی ستارہ پرستی کے زیر اثر تجویز کیا۔ ان کا خیال تھا کہ انسانی روح جو درحقیقت آزاد اور پاکیزہ ہے سیاروں کی قید میں محبوس ہے اور ان کے مادی اثرات میں مقید۔ نجات حاصل کرنے کے لیے اسے انہی سیاروں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ ان سیاروں میں مختلف ہستیاں ہیں جو روح کو آگے بڑھنے سے روکتی ہیں۔ ان ہستیوں یا قوتوں پر صرف چند منتروں سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ عرفانیوں کے نظام اخلاق میں اس طرح کے منتروں کی بڑی اہمیت تھی اور جو شخص ان کے حلقے میں داخل ہوتا اس کو بے شمار منزلوں سے گزرنے کے بعد ان منتروں سے واقف کیا جاتا تھا۔ جب انسان ان تمام مراحل کو کامیابی کے ساتھ طے کر لیتا ہے تو وہ حقیقی آزادی حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن یہ آزادی جسم اور مادے کی موجودگی میں ممکن نہیں کیونکہ ان کے نزدیک مادہ اپنی فطرت کے لحاظ سے روحانی زندگی کا اہل نہیں۔ انسانی روح کی نجات یا بقا کا امکان ان کے نزدیک جسم اور مادے کی تباہی اور موت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان کے ہاں حیات بعد الموت کا تصور خالص روحانی ہے جس میں جسم کی بقا شامل نہیں۔ روح موت کے بعد وجود خداوندی میں مدغم ہو جاتی ہے۔

نجات کا دار و مدار اخلاقی اعمال و نیک نیتی پر نہیں جتنا کہ خفیہ علم، مختلف اوراد اور منتر اور چند رسوم کی ادائیگی پر ہے۔ اخلاقی اعمال ان کی نگاہ میں ایک طرح کا بندھن ہیں جو مادہ اور روح کی غلط آمیزش کو صحیح سمجھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ مادہ اور جسم ہر حالت میں بدی کا سرچشمہ ہیں اور اس لیے انسان کی تمام جد و جہد صرف اس ایک بات پر مرکوز ہونی چاہیئے کہ وہ ان سے جلد از جلد نجات حاصل کر سکے۔ اعمال کی ضرورت بالکل نہیں۔ حقیقی چیز جس کی اشد ضرورت ہے وہ علم کا حصول ہے اور یہ علم کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف چند چیدہ انسانوں کی صحبت اور جسمانی ریاضت سے

ملتا ہے یہی علم ان کی اصطلاح میں عرفان ہے جس کی بنا پر اس تحریک کا نام رکھا گیا۔ اس نظریہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انسانوں کے دو مختلف مدارج قرار پائے۔ ایک طرف تو عوام کی اکثریت تھی جو اس قابل نہ تھے کہ وہ مجوزہ تربیت کی مشکلات سے عہدہ برآ ہو سکیں اور اس لیے نجات کا راستہ ان پر ہمیشہ کے لیے بند تھا۔ دوسری طرف وہ مختصر سی اقلیت تھی جو زندگی کے روزمرہ کے مشاغل سے کلیتہً علاحدہ ہو کر اپنی توجہ اس امر پر مرکوز کر بیٹھے کہ اس عرفان کو حاصل کیا جائے جس سے وہ مادی جسم کی قید سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر سکے۔ اس تقسیم سے جو نقصان معاشرہ کو ہوا وہ ظاہر ہے یعنی عوام کو اس بہترین علم سے ہمیشہ کے لیے محروم رہنا پڑا جو صرف چند افراد حاصل کر سکے تھے اور جس کے بغیر ان کے خیال کے مطابق نجات ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ کائنات اور انسان کے متعلق اس سے قنوطی خیالات کا پیدا ہونا یقینی امر تھا۔ اور دین کی بنیاد محض علم و عرفان پر نہیں بلکہ ایمان و یقین پر ہے۔ جو نظریۂ حیات اور طریقۂ زندگی انسانوں کو اطمینانِ قلب نہیں دے سکتا جس سے ان کو اپنے مستقبل کے متعلق کوئی تشفی بخش جواب نہیں مل سکتا اور جس کو اختیار کرنے سے ان کی اور ان کے عزیزوں اور دوستوں کی ابدی بھلائی ممکن نہیں، ایسا دین ایک عارضی اور وقتی طور پر تو کامیاب ہو سکتا ہے لیکن اس میں استقلال اور پائداری نہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ثنویت کا یہ تصور مادے اور جسم کی فطری بدسرشتی اور زاہدانہ زندگی کی سخت کوشیاں باوجود اپنی خرابیوں کے دنیا کے انسانوں کو بعض مخصوص ادوار میں ضرور پسند آتی رہی ہیں۔ (باقی آئندہ)

حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق

مصنفہ بشیر احمد ڈار

عہد قدیم میں چین، ایران، مصر اور یونان کی تہذیبوں نے حیرت انگیز ترقی کر لی تھی۔ اور یہاں کے مفکروں نے جو افکار و نظریات پیش کیے انہی کی بنیاد پر جدید افکار کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ اور اس کتاب میں کون فیوشس، گوتم بدھ، زرتشت، مانی، سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے عظیم مفکروں اور مصر قدیم کے فلسفیوں کے اخلاقی نظریات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور